میرؔ کا تصورِ معیشت

حافظہ عائشہ صدیقہ

Hafiza Ayesha Siddiqa
M.Phil Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:
Mir's poetry is intertwined with universal truths and ground realities.Mir's vision of the economy seems clear and deep.The hardships with which Mir lived his life is a telling proof of his economic condition.His poetry also shows clear signs of economic failure of that era.Poor people are the victims of economic turmoil in any country.Their life become miserable.Despite of being renowned poet ,Mir also faced the same situation,which he has repeatedly mentioned in his poetry.He not only lamented his helplessness but also represented the situation of the middle class of his time.Mir's vision of the economy is broad based.This research paper seeks to cover the various aspects of his concept of economy.

شاعری صرف دل کی متنوع کیفیات، جذبات و احساسات کی رنگارنگی کے اظہار کا نام ہی نہیں بلکہ وقت کے آئینے پر ٹھہری ہوئی ظلم و بربریت، اذیت، مصیبت، اجنبیت اور بحر ظلمت کی وہ متحرک تصویریں ہیں جن کا عکس ہمیں موجودہ زمانے میں دکھائی دیتا ہے۔ شاعر اپنی تخلیقی فعالیت سے ماضی کے جھرونکوں سے گزرے وقت کی سرگزشت سناتا ہوا حال کے آئینے میں فکر و حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے، جس سے اس کے عصری شعور کا بین اظہار ہوتا ہے۔ جو شاعر حال و قال کو ایک فریم ورک میں سمو کر صورت گری کرنے پر قادر ہو، اس کی شاعری یقیناً آفاقی صداقتوں کی حامل ہوتی ہے۔ ایسی ہی ذہنی بصیرت و ذکاوت ہمیں میرؔ کے ہاں دکھائی دیتی ہے جو ذہنی پراگندگی اور معاشی بدحالی کے باوجود زندگی اور معاملات زندگی کے اصل معنویت کے بھید کھول سکتی ہے۔

میرؔ نے اپنے سوز و گداز سے جہاں مدھم لَے میں غم سنایا ہے، وہاں انہوں نے اپنی طبع روانی سے اس دنیا کے سب رنگ ڈھنگ کو اپنے خیالات سے آہنگ کر کے شاعری کے کینوس پر یوں سجایا ہے کہ اس میں ان کے احساسات، جذبات، اختیارات، خواہشات، ضروریات غرض ہر کیفیت واضح دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے صفحات پر سبھی یہی خواہشات جب ضروریات کا روپ دھار لیتی ہیں تو "معاشی تصورات" جنم لیتے ہیں۔ میرؔ کے ہاں تصور معیشت کا واضح اور

گہرا شعور نظر آتا ہے۔ میرؔ کی معاشی بدحالی نے ان کی زیست کو جس تلخی سے دوچار رکھا اس کی الم ناکی ان کی شاعری میں جابجا سنائی دیتی ہے۔

میرؔ نے صرف اپنی بے چارگی، بے بسی، بے کسی کا رونا نہیں رویا بلکہ ہر دور کے متوسط طبقے کی معاشی بدحالی کی ترجمانی کی ہے کہ جب امراء و وزراعیش کوشی کی روش اختیار کر کے اپنے فرائض کی بجا آوری اور عوام کی خدمت سے چشم پوشی کر لیتے ہیں تو ملکی معاشی حالات دگرگوں ہو کر بے چارے مفلس و غریب کو معیشت کی چکی میں پیستے پیستے مفلس و قلاش کر دیتے ہیں۔ میرؔ خود بھی اس زبوں حالی کا شکار رہے۔ معیشت کی زبوں حالی اور عوام کی خستہ سامانی کا ایک مرقع جو میرؔ نے دو سو سال سے زائد عرصہ قبل پیش کیا وہ بعینہٖ آج کی بدحال، رنجور و مجبور عوام کے جذبات کا غماز ہے۔ ان کی کہانی میرؔ کی زبانی ملاحظہ ہو:

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں | یاں بہم پہنچے ہے جگر ہو خوں
تم کہو آٹا کرکرا کھایا | یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا
اور دو چار روز یہ بھی ہے | ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے
فصل ہونے ابھی نہیں پائی | پیشگی سب سے قرض لے کھائی
ماش کی دال کا نہ کریے گلا | گوشت یاں ہے کبھو۔ 'کسو' کو ملا
بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس | کھائو دال اور پادوبے وسواس(١)

دورِ حاضر میں یہی صورت نظر آتی ہے کہ غریب و غربا معیشت کی چکی میں پستے ہوئے گوشت تو کجا، دال روٹی کے لیے بھی محتاج نظر آتے ہیں۔ گویا میرؔ نے صرف اپنی زبوں حالی کو لفظوں کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کیا بلکہ اس میں ہر دور کے متوسط اور افلاس زدہ طبقے کا اجتماعی کرب ڈھل کر سامنے آتا ہے۔

میرؔ کے معاشی حالات پر نگاہ ڈالیں تو میرؔ معاش کے لیے ہر لمحہ کٹھن اور تکلیف دہ حالات سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ میرؔ کے والد چونکہ درویش انسان تھے اس لیے افراطِ زر کی خواہش کبھی ان میں پیدا نہ ہوئی، جو بھی حالات رہے، صبر و شکر کا رویہ اپنایا۔ یہی قناعت و رضا میرؔ کو وراثت میں ملی۔ درویشوں کی صحبت نے اسے مزید تقویت بخشی۔ کم عمری میں والد کی وفات اور ادائیگی قرض کی وصیت نے انہیں فکرِ معاش میں مبتلا کر دیا۔ سوتیلے بھائی کے سرد رویے نے ایسے مشکل حالات میں اور مضمحل کر دیا۔ ان مشکل ترین حالات میں میرؔ نے جس بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا وہ ان کا ہی کمال تھا۔

پہنچا بہم علاقہ اے عزلتی کسو سے
کرنا معاش اکیلے اتنا کمال کیا ہے(2)

معاش کی تلاش انہیں آگرہ سے دہلی لے آئی۔ یہاں نواب صمصام الدولہ کی بارگاہ سے ایک روپیہ روز وظیفہ

مقرر ہوا۔ نادر شاہ کے حملے میں صمصام الدولہ زخمی ہونے کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تو اس وظیفہ کی بندش ہو گئی۔ ناچار پھر واپس لوٹ آئے۔ 3 نادر شاہ کے حملے کے بعد حالات جب قدرے مساعد ہوئے تو پھر فکر معاش میں دلی کی طرف سر گرداں ہوئے اور زندگی کے ایام ان کے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزو کے ہاں بسر ہونے لگے۔ ان سے قطع تعلقی کے بعد رعایت خان کے ساتھ متصل ہو گئے۔ رعایت خان نے ایک بار میرؔ سے کہا کہ وہ مراثی لڑکے کو کچھ اشعار یاد کروادیں۔ یہ بات میرؔ کی انانیت نے گوارانہ کی اور ملازمت ترک کر دی۔ کچھ عرصے بعد میرؔ نے نواب بہادر جاوید خاں کی ملازمت اختیار کر لی لیکن ان کے قتل کے بعد میرؔ پھر بے روزگار ہو گئے۔ میرؔ زندگی گزارنے کے لیے شوریدہ حالی سے شب وروز زمانے کی کڑواہٹ کو اندرانڈیلتے اور سرد و گرم کو جھیلتے رہے۔

شب و روز اپنے بسر یوں کرے
معیشت زمانہ میں جوں توں کرے(۴)

وقت کی تند لہریں انہیں خس و خاشاک کی طرح بہاتی راجہ جگل کشور کی طرف لے گئیں پھر اس کے بعد راجہ ناگر مل کے دست نگر ہونا پڑا۔ ایسی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں میرؔ جیسا حوصلہ مند انسان بھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتے، آزار اٹھاتے اور معاش کے لیے جوتیاں چٹخاتے بلبلا اٹھتا ہے اور یوں شکوہ کناں دکھائی دیتا ہے:

غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دست نگاریں
کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا

راجہ ناگر مل کا ساتھ بھی قدم قدم پر خارِ زار تھا۔ کئی لشکروں کی ہمراہی رہی اور آخر مرہٹوں کی یورش اور لوٹ مار کے بعد جب راجہ کے بڑے بیٹے جس کے ہمراہ میرؔ تھے، کی مالی حالت خراب ہوئی تو میرؔ کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ اس حال کا احوال ذکر میرؔ میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ”میں بھیک مانگنے کے لیے اٹھا اور شاہی لشکر کے ہر سردار کے در پر گیا۔ چوں کہ شاعری کی وجہ سے میری شہرت بہت تھی، لوگوں نے میرے حال پر خاطر خواہ توجہ کی۔ کچھ دن کتے بلی کی سی زندگی گزاری اور (آخر کار) حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہ الدین خاں سے ملا۔ اس نے میری شہرت اور اپنی اہلیت کے مطابق تھوڑی بہت مدد کی اور بہت تسلی دی۔“ (۵)

فکر معاش میں میرؔ نے جگہ جگہ بود و باش اختیار کی اس دوران ان پر دلخراش واقعات گزرے جس نے انہیں زندہ لاش بنا دیا جو ہر گزرتے لمحہ اس آرزو میں رہتا کہ کاش اب کے برس بہار کی مہکار میں اس کی زندگی کی شام ہو جائے تاکہ اسے اس زندگی کو بسر کرنے کے لیے چاروناچار ہر خار کے ساتھ گزارانہ کرنا پڑے۔

ہائے سم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جان عزیز گئی ہوتی کاش اب کی سال بہار کے ساتھ (٦)

یہ میرؔ ہی کی نہیں بلکہ اس بے بسی کی صدا تھی جو ہر دل سے بلند ہو رہی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے عروج کی رونقیں تاراج ہو رہی تھیں۔ نااہل حکمرانوں کی سرپرستی اور جانشینوں کی ہوس اقتدار نے انہیں آپس میں برسرپیکار کر رکھا تھا۔ اندرونی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور مفاد پرستی نے مغلیہ سلطنت کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے مغلیہ سلطنت کے لرزہ خیز ڈھانچے کو توڑنے کے لیے کاری ضرب ثابت ہوئے۔ سیاسی، سماجی و معاشی ہر لحاظ سے انتشار و اضطراب برپا تھا۔ داخلی و خارجی اثرات نے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا۔ معاشی بدحالی، ابتری اور زندگی کی محرومیوں اور شکستگی نے کشتہ ستم عوام کے اندر پژمردگی اور مردنی طاری کر دی۔ مفلوک الحالی، بھوک، ننگ نے عزتِ نفس کو مجروح کر کے نیکی وبدی کے احساسِ سودوزیاں سے ماورا کر دیا۔ سارے برصغیر میں معاشرتی و معاشی حالات یکساں طور پر خراب تھے۔ جن کو تخت و تاج کا دماغ تھا، ان کی عزتیں، شان و شوکت دلی کی سڑکوں پر پامال ہو کر خاک ہو گئیں۔ امیر فقیر ہو گئے اور مسخرے وزیر بن بیٹھے۔ یہ ایک سلطنت کے بکھرنے اور ٹوٹنے کی لرزہ خیز اور اعصاب شکن تصویر ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کے مٹنے کی المیہ داستان تھی جہاں رنج والم کے مہیب سناٹوں میں ضمیر کی آواز سننا محال تھا۔ سیاسی انتشار، ذہنی پراگندگی اور معاشی بدحالی نے تہذیب کے آداب کو بھلا دیا۔ معاشی ہلاکت انگیز تباہی نے سلطنت کی مالیات کا ڈھانچہ تباہ کر کے رکھ دیا۔ نظم ونسق کی ابتری نے صرف معاشی ہی نہیں بلکہ اخلاقی، سیاسی، سماجی انحطاط پیدا کر دیا۔ اس دور میں ایک مٹتی، بلکتی، سسکتی تہذیب کا حادثہ ہے جو میرؔ کی شاعری میں مرقوم ہے۔ سوختہ نصیب میرؔ زندگی کے ان گوناگوں حالات سے کبھی راہ فرار نہ اختیار کر سکے اور اس ابتلائو آزمائش سے بیزار نظر آنے لگے۔ جس کا بیان میرؔ اپنی کتاب "ذکرِ میرؔ" میں اس طرح کرتے دکھائی دیتے ہیں:

"غرضکہ ضعف قویٰ، بیدماغی، ناتوانی، دل شکستگی، اور آزردہ خاطری سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا۔ زمانہ بھی رہنے کے لائق نہیں رہا ہے اس سے دامن جھٹک دینا ہی اچھا ہے۔" (٧)

میرؔ جیسا شخص جو زبانِ حال سے یہ پکار اٹھے کہ "اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے" لیکن اتنے اندرونی و بیرونی انتشار کا شکار رہنے کے بعد میں ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ انہوں نے خود کو اپنی آہنی حوصلے کی دیوار کے پیچھے سمیٹ کر رکھا اور دل شکستہ کے باوجود اپنا معیار و وقار بلند رکھتے ہوئے لہجے میں توازن برقرار رکھا۔ اس غم کدے میں زندگی کی جو بھی صورت نظر آئی، گوارا کر لی لیکن ان کی غمگینی اور شوریدگی ان کی ہمسفر بنی رہی:

کیا معاش اس غم کدے میں ہم نے دس دن کی بہم
اٹھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لیے ماتم گئے(8)

ہر انسان اپنے ذوق کے مطابق کسب معاش کے ذرائع تلاش کرنا چاہتا ہے، جس میں اس کا شوق بھی ہو اور اس کے شخصی رجحان اور میلانات کے مطابق ہو تاکہ وہ اس سے معاشی تسکین کے ساتھ ذہنی سکون کا بھی سامان کر سکے۔ میرؔ کا مشرب شاعری تھا، سو انہوں نے اسی کو کسب کے لیے موزوں جانا۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا(9)

میرؔ کے ہاں تصور معیشت مختلف زاویوں سے دکھائی دیتا ہے۔ ہر شخص معیشت کے میدان میں قسمت آزمائی کرتا ہے تاکہ اپنی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق معاشی حالات کو بہتر کرتے ہوئے اپنا طرز زندگی بلند کر سکے۔ عوام کی ضروریات کے مطابق جس چیز کی طلب زیادہ ہوتی ہے رسد بھی اتنی بڑھ جاتی ہے۔ ہر کوئی بازاری طلب کے مطابق سامان بیچ کر اس نظام کے پہیے کو چلاتا اور اپنی روزی کماتا ہے۔ سرمایہ دار اپنی حیثیت کے مطابق سرمایہ کاری کر کے پیداواری عوامل مد نظر رکھتا ہے اور زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ میرؔ جہاں سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے انفرادی فلاح و بہبود کے خواہاں ہیں، وہاں وہ اشتراکی نظام کے ذریعے اجتماعی بہتری کے بھی خواہش مند نظر آتے ہیں۔ فارغ البالی اور خوشحالی کا جو خواب میرؔ نے اپنی آنکھوں میں سجایا، اس خواب کی آرزو نے میرؔ کو خون کے آنسو رلایا۔ ان کی یہ کسمساتی خواہش حسرت کی تصویر بن کر رہ گئی۔ ایک مثنوی میں وہ اپنی اس خوابیدہ خواہش کا اظہار یوں کرتے ہیں:

سن کے اس بات کو نر اے ہم
بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم
تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بہ قدر حباب
جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنے بودو باش کریں(١٠)

بازار معیشت میں سرمایہ دار اس چیز میں پیسہ صرف کرتے ہیں جس چیز کی طلب اور کھپت زیادہ ہو۔ وہ اس کو بنانے کے لیے ایسے طریقے اور ذرائع اختراع کرتے رہتے ہیں جس میں لاگت کم آئے اور وہ نفع زیادہ پائیں۔ لیکن اس نظام

میں بھی امرا گردی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بازاری قوتوں کے اجارہ دار بن بیٹھتے ہیں اور چھوٹے غریب سرمایہ دار کو ابھرنے اور نکھرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اسے مختلف حیلوں وسیلوں سے پابندیوں میں جکڑ کر اس کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے تاکہ ان کے اپنے منافع کی شرح کم نہ ہو اور اس غریب کی بازاری حیثیت مستحکم نہ ہو۔ اس تصادم سے نظامِ معاش کا توازن بگڑتا ہے۔ آجر مضاربت کے ذریعے غریب مزدور کی محنت سے فائدہ تو ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ان کو معاوضہ پورا نہیں دیتے۔ ان کی اجرت کی شرح کم کر کے ان کی محنت کو ہضم کر لیتے ہیں۔ یوں دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی رہتی ہے۔ میرؔ کے زمانے میں بھی یہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ امرا دولت کے انبار لگا کر دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہے اور غریب غربا اس کے حصول کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ امرا کی عیش کوشی کی وجہ سے متوسط طبقے کا استحصال ہوتا رہا جس کے بارے میں میرؔ یوں گویا ہیں:

امیر زادوں سے دلی کے مل نہ تا مقدور
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے (11)

سرمایہ دار ہمیشہ اسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے جہاں اسے منفعت بخش سودے کی امید ہو اور اس چیز کی مانگ بازار میں سب سے زیادہ ہو۔ میرؔ چونکہ بازارِ عشق کے بیوپاری نظر آتے ہیں۔ اس بازار میں ہر طرح کے خریدار نظر آتے ہیں جو گراں بار سودے کے لیے اپنی جان بھی وار دیتے ہیں۔ اس بازار میں دل بھی ایک ایسی قابلِ انتفاع شے ہے جسے ہر کوئی کسی بھی قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سارے بازار جہاں کا ہے یہی مول اے میرؔ
جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو (12)

اسی لیے صاحبِ دل اسے بیچنے کے لیے سرِ بازار چلے آتے ہیں لیکن بسا اوقات اشیا کی گراں بانی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کو خریدنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں رہتی۔ لوگ اس کے طلبگار ہوتے ہوئے بھی اپنی خالی جیب پر صرف نظر کرتے ہیں کہ خواہش کے باوجود وہ استطاعت نہیں رکھتے۔ بازارِ عشق میں دل چونکہ ایک ایسا سرمایہ ہے جس کا حصص سب سے زیادہ بکتا ہے اور آجر وہی چیز بیچنے کے لیے سر بازار لاتا ہے جس کا مول سب سے زیادہ ملے لیکن بعض اوقات اسے گھاٹے کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ جیب جب خالی ہو اور قوتِ خرید بھی کم ہو تو ایسے نفع بخش سودے نقصان میں بدل جاتے ہیں۔

دل عجب جنسِ گراں قدر ہے بازار نہیں
وے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں (۱۳)

جب رسد طلب سے بہت زیادہ بڑھ جائے اور قیمتی چیز بھی عام عوام کی پہنچ میں بآسانی آجائے تو چیز کی قدر اور

مانگ گھٹ جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے نزدیک بے مول ہو کر ناکارہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور جب معاشی حالات گردش دوراں کے باعث نامساعد ہو جائیں اور کاروبارِ زمانہ سرد پڑ جائے تو چیز خواہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو، خریدار دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا ضرور ہے لیکن کوئی اس کا مول نہیں پوچھتا۔

مرد مان شہر پر کریں کیا دل کو عرض
ایسی جنس ناروا کو مفت کوئی واں نہ لے(14)

ایسی اشیا جو خریدار کی ضرورت کے عین مطابق نہیں رہتی اور نفع کی بجائے نقصان کا باعث بنتی ہیں تو دکان دار اپنی دکان بڑھانے کے لیے کوئی متبادل طریقہ کار اختیار کر لیتا ہے۔ جو کوئی مالی حیثیت رکھتا ہے وہ بازار مندا ہونے کے باوجود اپنے مال و متاع کو داؤ پر لگا کر خریدار کی توجہ پانے کے لیے جنسِ حسن کو بازار میں لے آتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر دل مچلتا اور تڑپتا ہے۔

بازار میں جہان کے ہے حسن کیا متاع
سو جی سے جس نے دیکھا خریدار ہو گیا(۱۵)

روز بازار میں عالم کے عجب شے ہے حسن
بک گیا آپ ہی جو اس کا خریدار ہوا(16)

جب ہر کوئی اس متاع کا خواہاں اس کو پانے کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، چاہے اسے یہ سودا کتنی ہی مہنگی قیمت پر اپنا آپ گروی رکھ کر ادھار ہی کیوں نہ لینا پڑے، تو دکان دار خریدار کی کمزوری سمجھتے ہوئے اس کے دونے دام وصول کرنا چاہتا ہے اور اپنے کاروبار کو چمکاتا ہے۔

حسن بازار جہاں میں ہے متاع دلکش
صاحب اس کا ٹھگے جاتا ہے خریداروں کو(۱۷)

نظام معیشت میں کچھ چیزیں ایسی بنیادی حیثیت کی حامل ہوتی ہیں کہ حالات چاہے کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، ان کی حیثیت مستحکم رہتی ہے۔ وہ خواہشات کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ ضروریات زندگی کے لیے ازحد ضروری ہوتی ہیں۔ اپنا روزگار کرنے کے ہر ذی روح کسی نہ کسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس کا روزگار برقرار رہے، چاہے اسے کسی بھی حد سے گزرنا پڑے۔

بیچتا سر کیوں نہ گلیوں میں پھروں
میں ہوں خواہاں لطفِ تہ بازار کا(18)

میرؔ بھی اسی نظام معیشت کا حصہ رہے جہاں بازار میں ہر چیز بکنے کے لیے چلی آتی تھی چاہے وہ دل ہو، جنس حسن ہو، جان ہو، عزت ہو، پگڑی ہو، خرقے ہوں یا جامے ہوں۔ میرؔ بھی اس گردش دوراں کا شکار رہے۔ حالات کی اس کشمکش کو دور کرنے کے لیے جو طبیعت نے موزوں کیا، کر گزرے، چاہے انہیں ہاتھ کی محنت سے دستکاری ہی کیوں نہ بنانی پڑی، وہ مرد آہن ہمہ تن کوشش میں لگا رہا۔

چہرہ یہ جیسے زخم ہے ناخن کا خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں(١٩)

میرؔ اس بازار میں جنس وفا بھی لے کے نکلے کہ شاید اس نایاب شے کا کوئی خریدار ملے لیکن جب معاشرے میں احتکار یا کساد بازاری ہو تو پھر ایسی نایاب چیزوں کا بھی کوئی مول نہیں رہتا۔

کیا کروں جنس وفا پھیرے لیے جاتا ہوں
بخت بد نے نہ اسے دل کا خریدار کیا(20)

اچھی ہی ہے یہ جنس وفا یاں لیک نہ پائی ہم نے کہیں
داغ ہوئی ہے جان ہماری اس شے کی نایابی کی(٢١)

میرؔ کی سیہ بختی ساری زندگی غم کے سائے کی طرح ان پر چھائی رہی۔ اس غم روزگار نے میرؔ کو تڑپنے، بلکنے، سسکنے پر مجبور کر دیا۔ زندگی کے رنج والم جونک کی طرح ان کے ساتھ چمٹے، ان کا خون چوستے رہے۔ روزگار کی بلائیں زندگی بھر ان کے سر پر منڈلاتی رہیں۔

لوہو، رونے سے سب نچوڑ لیا
اب پیے خون روزگار عبث(22)

میرؔ کی تیرگی کبھی کم نہ ہونے پائی۔ وہ دن رات غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں اشک شوئی کرتے رہے۔ جب کچھ نہ بن پایا تو میرؔ بے کسی، بے بسی کی تصویر بنے چرخِ کہن کے زخم سیتے اور لہو پیتے رہے۔ اس آفتِ روزگار سے متصل ہونے کے بعد زمانہ ان کے لیے کبھی سازگار نہ ہوا۔ تاحیات کی اس مشکل نے اس بے ثبات دنیا میں انہیں دن رات تڑپایا۔

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا(٢٣)

روز و شب روتے کڑھتے گزرے ہے
اب یہی اپنا روزگار ہوا(٢٤)

کیا دل کو خوں کیا کہ تڑپنے لگا جگر
یکتائے روزگار ہیں ہم اس ہنر کے بیچ(٢٥)

زمانے کی بڑھتی ہوئی شورشوں نے ہر صاحبِ کمال کو مائل بہ زوال کر دیا۔ حالات کی خرابی نے عام عوام کو تو کیا ،متمول اور اعلیٰ نسب کے لوگوں کو بھی اتنا مجبور کر دیا کی ان کے خرقے و جامے بھی بازار میں بکنے کے لیے چلے آئے ۔ایسے دور پر فتن میں بھی میرؔ پر یاسیت طاری دکھائی نہیں دیتی۔ وہ امید کا دامن تھامے صبر و شکر اور رضا و تسلیم میں راہ پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ حال جیسا بھی ہو مانند گلِ شگفتہ اس کو گزارنا چاہئے۔

مت اس چمن میں غنچہ روش بودو باش کر
مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر(26)

جب میرؔ کو معاشرے کے انتشار اور بگاڑ کے باعث اپنے ارد گرد ہنگامہ حشر برپا نظر آتا ہے تو وہ کلمہء شکر بجا لاتے ہیں کہ گردش روزگار کی خرابی کے باوجود ان کے پاس اس خرابے میں رہنے کو کچھ آسرا باقی ہے:

گرچہ کچھ روزگار ہے تاحال بڑھتی ہے حال کی خرابی روز
پر اسے مجھ سے عار ہے تاحال(27) خستہ جانی نے ننگ خلق کیا

اس مشکل ترین حالات میں بھی میرؔ نے اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھا۔ قناعت جو ان کی جبلت و تربیت میں شامل تھی، وہ اس کیفیت کو ہر حال میں بر قرار رکھے ہوئے زندگی کے دن کاٹتے اور مشکلیں پاٹتے رہے۔ بے زری نے ان کے دلِ داغ دار کو تکلیفوں کے غبار سے بے قرار کیے رکھا لیکن انھوں نے اپنے نفس پر اپنا اختیار باقی رکھا اور کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی بجائے لبوں پر مہر لگالی:

بے زری سے داغ ہیں لیکن لبوں پر مہر ہے
کہیے حاجت اپنی لوگوں سے جووے ہوں مال کچھ(28)

یہاں ہمیں میرؔ کا صوفیانہ پہلو بھی نظر آتا ہے۔ درویشی و بے نیازی کا جو رویہ انھوں نے بچپن میں دیکھا، وہ ان مٹ نقوش چھوڑتا ہوا ان کے دل و دماغ پر ایسے ثبت ہوا کہ بے طاقتی کا روگ بھی اسے نہ مٹا سکا۔ وہ توکل جیسی صفت سے متصف کیفیتِ انتظار کو تو گوارا کر لیتے ہیں لیکن انھیں بے زری سے اذیتِ رسوائی قبول نہیں:

نہ کیونکہ شیخ توکل کو اختیار کریں
زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں(٢٩)

میرؔ کی زندگی استغنا سے عبارت ہے۔ انھوں نے روکھی سوکھی تو قبول کر لی لیکن اپنی انا اور غنا پر حرف نہیں

آنے دیا۔ مردِ حق کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ مقامِ تکلیف پر صبر کرتے ہیں مگر دامانِ رحمت سے مایوس ہو کر دامنِ امید نہیں چھوڑتے اور اپنے معیار اور وقار کا سمجھوتہ نہیں کرتے۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے (30)

میرؔ کو اس بات کا کلی ادراک تھا کہ جب آمدنی محدود اور ذریعہ معاش مسدود دکھائی دے تو انسان کو اپنی لامتناہی خواہشات کو حدود میں رکھنا چاہیے کیونکہ انسان اپنے شوق بھی تبھی پورے کر سکتا ہے جب اسے مالی لحاظ سے آسودگی حاصل ہو لیکن اگر انسان طریقہ وسلیقہ رکھتا ہو تو ہر امر کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ میرؔ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ جب ضرورت سے زیادہ حاصل ہو تو لاحاصل کی تمنا رکھنی چاہیے ورنہ درویشانہ و قلندرانہ طرزِ زندگی اس کا بار نہیں اٹھا سکتی۔

عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح کے خرچ لاحاصل کو دولت چاہیے (٣١)

اگر انسان قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو وہ قرض کے بار تلے دب کر مرض کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ ایسا بوجھ ہے جو انسان کو نوچ نوچ کر کھاتا اور دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ اس لیے شکیبائی کا رویہ اپناتے ہوئے اپنی چادر دیکھ کر پائوں پھیلانے چاہیے ورنہ قرض کا مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور سود کا طوق گلے میں ڈال کر انسان کو بے چارگی کی مجسم تصویر بنا دیتا ہے۔ اس لیے چاہے بازارِ عشق ہو یا بازارِ دنیا، کسی بھی قیمت کو اس بوجھ کو جلد اتار دینا چاہیے۔

سر دے کے میرؔ ہم نے فراغت کی عشق میں
ذمہ ہمارے بوجھ تھا بارے ادا ہوئے (32)

میرؔ کا تصورِ معاش بہت واضح اور زمینی حقائق سے جڑا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کی تلاش کے امکان میں درپیش تمام تلخیوں کو بھی مد نظر رکھتے ہیں جو اس معاش کی راہ میں رکاوٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں دیدہءدل وا کر کے دکھایا ہے جہاں غموں سے چور خستہ و شکستہ دل ہے جسے غموں سے فراغ نصیب نہیں ہوا۔

روز و شب کی اپنی معیشت نقل کریں کیا تم سے میرؔ
دن کو قیامت جی پہ رہے ہے سر پہ بلا لاتی ہے رات (٣٣)

کیا اپنی ان کی تم سے بیاں کیجیے معاش
کیں مدتوں رکھا جو تنک مہرباں رہے (٣٤)

مجروح ہم ہوئے تو نمک پاشیاں رہیں
ایسی معاش ہووے جہاں کیا مزا رہے(۳۵)

معیشت کے سنہرے اصولوں میں پورا تول، مناسب مول، کھرا کھوٹا الگ اور سودا نقد جیسے اصول لاگو ہوتے ہیں لیکن جہاں فرسودہ نظام رائج ہو، سود، قمار، سٹہ بازی کا بازار گرم ہو، اخلاقی قدریں زوال پذیر ہوں، ناداری اور پسماندگی نے ضمیر کو بے موت مار دیا ہو تو وہاں لوگ اپنی دکانداری بڑھانے کے لیے، اپنا خراب مال بیچنے کے لیے جھوٹ، مکر و فریب، دغا و جفا سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جس کی تصویر کشی میرؔ یوں کرتے ہیں:

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ رفتہ رفتہ ترا ہوگیا رواج
تیری متاعِ باب ہے ہر چار سو میں آج
اے جوٹھ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جوٹھ بولنے سے عرصہء تلاش(۳۶)

جب امیر حکومت ہی دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنے والے اور اپنی خواہشات کے حصول کے لیے ناجائز طریقے اپنائیں تو معاشرے میں بھی یہی طریقے رواج پا جاتے ہیں۔ لوگوں میں جھوٹ سچ، حلال و حرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو میرؔ یوں فاش کرتے ہیں:

سردار جس سے سب متعلق ہے کاربار
سچ بولنا ہے اسکے تئیں سخت ننگ و عار

ان کے اردگرد خوشامدی، عیار و مکار لوگوں کو ٹولہ اکٹھا ہو جاتا ہے جو چاپلوسی سے راہ و رسم بڑھا کر اپنی تجوریوں کے منہ تو بھر لیتے ہیں لیکن غریب کے منہ کا لقمہ چھین کر اسے تہی دامن کر دیتے ہیں۔ ایسے طوطا چشم لوگ تب تک جی حضوری پر کمربستہ رہتے ہیں جب تک ان کے مفادات کا تحفظ ہوتا رہے۔ یہ آستین کے سانپ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے کسی کو بھی ڈسنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے منافقت، جھوٹ، بداعتمادی، بے یقینی کا کاروبار عروج پر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کارزارِ جہاں میں جھوٹ، منافقت، ملاوٹ، دروغ گوئی کے باعث ہر چیز میں معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی تک بگاڑ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ہر شے کیفیت اور کمیت میں کم سے کم تر ہو کر ارزاں ہو جاتی ہے۔ میرؔ ان پامال روشوں سے بیزار و بے قرار ہو کر اپنے دل کا غبار نکالتے نظر آتے ہیں کہ ایسے حالات میں

انسانی جان مفت بھی بک جائے تو بھی غنیمت ہے۔

!مر کر بھی ہاتھ آوے تو میرؔ مفت ہے وہ
جی کے زیاں کو بھی ہم سود جانتے ہیں(37)

میرؔ کی شاعری کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو میرؔ لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی کرتے نہیں نظر آتے لیکن فکر و خیال کے سارے پہلو ان کے سامنے ہیں جو ان کی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے شکایت زدہ انداز اپناتے ہیں وہاں زندگی کی صداقتوں کو بھی ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ وہ معیشت میں صرف مال و منال کو ہی ضروری تصور نہیں کرتے بلکہ ہر وہ چیز جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے، اسے اہم جانتے اور گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اچھے اخلاق کی دولت سب سے قیمتی متاع اور بیش بہا ہنر ہے۔ اس دولت کی املاک میرؔ جیسے انسان کو بھی امیر بنا دیتی ہے۔

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہو گا(٣٨)

میرؔ تصور معیشت کے بارے میں استدلالی اندازِ فکر اپناتے ہیں کہ اس بار دنیا میں بسر کرنے کے لیے انسان ہر ممکن صورت گوارا کرتا ہے اور مختلف روزگار کے ذریعے گزر بسر کی راہ اپناتا ہے۔ روزگار موافق مل جائے تو دھن کمانے میں مگن ہو جاتا ہے۔ اس چار دن کی زندگی کے لیے اتنے تردد سے دوچار ہوتا ہے لیکن جس جہاں میں ساری زندگی گزارنی ہے وہاں کے لیے کوئی کسی سامان کا ارمان اس کے دل میں کیوں نہیں جاگتا کیونکہ اس دنیا سے جانے والا ہر شخص خالی ہاتھ جاتا ہے۔

لعل و یاقوت ہم زر و گوہر چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا(39)

میرؔ اس بے ثبات زندگی کی خار دار راہوں سے گزرنے کے باوجود اپنے مآل پر بھی خوب نظر رکھتے ہیں اور یہاں کی چکا چوند سے ان کی آنکھیں چندھیا کر انہیں غفلت زدہ نہیں کرتیں۔ میرؔ نہ صرف خود اس فکر میں لرزاں و پریشاں رہتے ہیں بلکہ اہل دنیا کو بھی نصیحت و وصیت کرتے نظر آتے ہیں کہ اس فانی دنیا میں جی لگانے کی بجائے فکر آخرت پر توجہ صرف کی جائے۔

توشۂ آخرت کا فکر رہے
جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک(40)

میرؔ کا تصورِ معیشت شش جہت نظر آتا ہے۔ اس میں ہر وہ پیغام نہاں ہے جو ہماری اسلامی تہذیب و روایات کا عکاس ہے۔ میرؔ اپنے دست بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے، توکل علی اللہ کی رسی تھامے رزق حلال میں زندگی کے مصرف کو

بہترین جانتے ہیں۔ میرؔ جہاں زندگی کی ناگہانی کو سہتے ہوئے اپنے زخموں پر اشک فشانی کرتے ہیں، واردات قلبی کی سچی ترجمانی کرتے ہیں وہاں اس عارضی زندگی کی پاسبانی کے لیے ایسے گر بتاتے ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کے راہ نجات مل سکتی ہے۔ میرؔ اپنی طبع رواں سے عوامی لہجے میں اظہار و بیان کے وہ سانچے میں اپنی فکر کو ڈھالتے ہیں جو ہر لمحہ تر و تازہ دکھائی دیتی ہے۔ میرؔ کے یہ آفاقی پیغام ہر نسل اور ہر زمانے کو سنانے اور بتانے کے لیے ہے کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، اپنی خودداری، وضع داری کو کبھی ترک نہیں کرنا چاہیے اور دنیا کی چکا چوند سے متاثر ہو کر اپنے ضمیر کا سودا نہ کریں، چاہے وہ کتنے ہی مہنگے نرخ پر فروخت ہو۔ خواہشات کے بارسے مغلوب ہونے کی بجائے اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہییں۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، کراچی: اردو دنیا، 1958ء، ص: 1002-۱۰۰۳

۲۔ ایضاً، ص: 532

۳۔ قاضی عبدالودود کے مطابق میرؔ یہ وظیفہ مقرر ہونے کے بعد آگرہ واپس چلے گئے تھے کیونکہ صمصام الدولہ کے لیے وظیفے کا آگرے میں بندوبست کرنا، چنداں مشکل نہ تھا۔ (بحوالہ: میرؔ کی آپ بیتی، نثار احمد فاروقی، دہلی: انجمن ترقی اردو، 1996ء، ص: 35)

۴۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، ص: 1147

۵۔ میر تقی میرؔ، ذکرِ میرؔ، مرتبہ: عبدالحق، مولوی، اورنگ آباد: انجمن ترقی اردو، 1928ء، ص: 122

۶۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، ص: 809

۷۔ میر تقی میرؔ، ذکرِ میرؔ (میرؔ کی آپ بیتی)، ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دہلی: انجمن ترقی اردو، 1996ء، ص: 211

۸۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، ص: 523

۹۔ ایضاً، ص: 133

۱۰۔ ایضاً، ص: 1016

۱۱۔ ایضاً: ص: 327

۱۲۔ ایضاً، ص: 618

۱۳۔ ایضاً، ص: 605

۱۴۔ ایضاً، ص: 514

۱۵۔ ایضاً، ص: 848

۱۶۔ ایضاً، ص: 853

۱۷۔ ایضاً، ص: 881

۱۸۔ ایضاً۔ ص: 849

۱۹۔ ایضاً، ص؛ 215

۲۰۔ ایضاً، ص:395
۲۱۔ ایضاً، ص:898
۲۲۔ ایضاً، ص:678
۲۳۔ ایضاً، ص:384
۲۴۔ ایضاً، ص:853
۲۵۔ ایضاً، ص:680
۲۶۔ ایضاً، ص:684
۲۷۔ ایضاً، ص:698
۲۸۔ ایضاً، ص:490
۲۹۔ ایضاً، ص:240
۳۰۔ ایضاً، ص:727
۳۱۔ ایضاً، ص:294
۳۲۔ ایضاً، ص:297
۳۳۔ ایضاً، ص:676
۳۴۔ ایضاً، ص:519
۳۵۔ ایضاً، ص:518
۳۶۔ ایضاً، ص:1048
۳۷۔ ایضاً، ص:220
۳۸۔ ایضاً، ص:141
۳۹۔ ایضاً، ص:151
۴۰۔ ایضاً، ص:199